Ḥājī Imdād Allāh Muhājir Makkī and Intra-Islam Harmony: An Analytical Study with Special Reference to the Treatise *Faiṣalah-i Haft Mas'alah* (*A Resolution of the Seven Controversies*)

Muhammad Akram۞

ABSTRACT

This paper deals with the Sufi shaykh Ḥājī Imdād Allāh Muhājir Makkī's (1817-1899) efforts for conciliation of different strands of Muslim religious thought in the late nineteenth century with special reference to his main work on this theme — a short treatise titled *Faiṣalah-i Haft Mas'alah* (literally: A Resolution of the Seven Controversies). The paper begins with a brief description of the colonial milieu and historical context of the emergence and persistence of theological differences between Sunni *'Ulamā'* of India from early decades of the nineteenth century onwards and explains how gradually the disciples and deputies of Ḥājī Imdād Allāh Muhājir Makkī got entangled into this problem. As he had

۞ Assistant Professor, Department of Comparative Religion, Faculty of Islamic Studies (Usuluddin), International Islamic University, Islamabad. (m.akram@iiu.edu.pk)

already migrated to Makkah, then a part of the Ottoman Caliphate, to escape the British colonial rule in India, his conciliatory role relied mainly on correspondence and occasional meetings with *'Ulamā'* of India who used to frequent Makkah for pilgrimage. Deliberately evading any judgments on (un)orthodoxy of different theological issues at hand, the paper ventures to figure out principles of his hermeneutics of conciliation. It is opined that though Ḥājī Imdād Allāh Muhājir Makkī did not succeed in halting crystallization of new sectarian identities among Muslims of South Asia because of various historical reasons, the principles of conciliation that permeate and underlie his teachings bear universal significance and thus have ample practical value in our own times for any project directed towards bringing about inter-communal harmony and tolerance between different Muslim denominations.

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور مسلکی ہم آہنگی:
'فیصلہ ہفت مسئلہ' کے خصوصی حوالے سے ایک مطالعہ

محمد اکرم ۞

تمہید

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۱۷ء/۱۲۳۳ھ- ۱۸۹۹ء/۱۳۱۷ھ) ماضی قریب کی اسلامی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ اپنی روحانی اور کرشماتی شخصیت کی بدولت وہ مسلمانانِ برّصغیرِ پاک وہند کے اکثر مکاتبِ فکر کے ہاں مقتدا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے میں مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو رفع کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ زیرِ نظر مقالہ ان کی تحریروں، ملفوظات اور بطور خاص ان کے رسالے **فیصلہ ہفت مسئلہ** کے تجزیہ پر مشتمل ہے۔ مقالہ تجزیہ کرتا ہے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اختلافی مسائل کی درجہ بندی کیسے کی اور مسلکی ہم آہنگی کے لیے ان کی تجاویز کی نوعیت کیا تھی؟

ضمنی طور پر یہ بحث بھی کی گئی ہے کہ ایسی اصلاحی کاوشیں اتنی کارگر کیوں نہ ہو سکیں اور برِصغیر میں مسلکی اختلاف کیوں بڑھتا چلا گیا؟ مقالے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات سے اتحاد امت اور مسلکی ہم آہنگی کے لیے ایسے عمومی اصول اخذ کر کے مرتب کیے جائیں، جن سے وسیع تر تناظر میں اور بطور خاص آج کل کے حالات میں استفادہ کیا جا سکے۔

پسِ منظر

دنیا کی بیشتر مذہبی روایات کی طرح مسلمانوں کی علمی تاریخ بھی دین کی متنوع تعبیر و تشریح کی حامل رہی ہے۔ اسلام کے بالکل ابتدائی عہد ہی میں متعدد سیاسی، تہذیبی اور دینیاتی عوامل کے تحت اختلافات سامنے

۞ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ تقابل ادیان، کلیہ اسلامک اسٹڈیز (اصول الدین)، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔
(m.akram@iiu.edu.pk)

آنا شروع ہو گئے[۱] اور مختلف فرقے وجود میں آ گئے جن میں سے بعض کی باقیات ہنوز موجود ہیں اور بعض تاریخ کا قصہ بن کر رہ گئے۔[۲] خیر القرون میں کسی دینی معاملے کے فہم میں اختلاف کو ایک فطری امر کے طور پر لیا جاتا تھا، چناں چہ مختلف کلامی اور فقہی مکاتب فکر کے درمیان بڑی حد تک قبولِ باہمی موجود تھا، مگر سیاسی زوال اور تہذیبی انحطاط کے دور میں مسلم معاشروں سے بتدریج ادبِ اختلاف مفقود ہوتا چلا گیا اور نقطۂ نظر کا فرق تفرقے کا سبب بننے لگا۔ کئی دردمند اہل نظر اور بزرگانِ دین اس صورتحال پر متفکر ہوئے اور اتحاد بین المسلمین کے لیے مقدور بھر کوششیں کیں۔ اس سلسلے میں برصغیر پاک وہند کی اولین کاوشوں میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سرفہرست آتا ہے جن کے ہاں اختلافی امور کے ضمن میں ایک طرح کے اعتدال اور وسعتِ نظر کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ فقہی مذاہب عمل بالحدیث، حبِ صحابہ واہل بیت اور تصوف میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود جیسے رجحانات اور نظریات میں موافقت پیدا کرنے کے لیے ان کی تصنیف **الإنصاف في بيان سبب الاختلاف**[۳] قابل ذکر ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اتحاد بین المسالک کے موضوع پر قلم اٹھانے سے یہ بات عیاں ہے کہ ان کے زمانے سے ہی مسلمانانِ برصغیر کی شیرازہ بندی میں خلل پیدا ہونا شروع ہو چکا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس افتراق کا تعلق برِصغیر میں مسلمانوں کی بتدریج ماند پڑتی سیاسی شان وشوکت سے تھا۔ چناں چہ خود شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ کر مرہٹوں اور جاٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے

۱۔ مسلمانوں میں پیدا ہونے والے اولین اختلافات کے اسباب کے لیے دیکھیے: ابوزہرہ مصری، **اسلامی مذاہب**، ترجمہ غلام احمد حریری (فیصل آباد: ملک سنز تاجران کتب، س ن)، ۲۸-۳۶؛ نیز دیکھیے: شبلی نعمانی، **علم الکلام اور الکلام** (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۷۹ء)، ۳۴-۲۰؛ اسلامی تہذیب میں فکری تنوع کے عوامل کے لیے دیکھیے: علی سامی النشار، **نشأة الفكر الفلسفي في الإسلام** (قاہرہ: دار المعارف، ۱۹۷۷ء)، ۵۹-۶۳۔

۲۔ تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ظہور پذیر ہونے والے فرقوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے: عبد القاہر بن طاہر البغدادی، **الفَرق بين الفِرق**(بیروت: دار الكتب العلمية، ۲۰۰۵ء)، ۱۲-۲۰؛ نیز دیکھیے: عبد الکریم شہرستانی، **الملل والنحل** (بیروت: دار الفكر، س ن)۔

۳۔ الشاہ ولی اللہ الدہلوی، **الإنصاف في بيان سبب الاختلاف**(لاہور: علماء اکیڈمی شعبہ مطبوعات، محکمۂ اوقاف، حکومتِ پنجاب، ۱۹۸۱ء)۔

خلاف مسلمانانِ ہند کی مدد کے لیے درخواست کرنا پڑی۔[۴]

مگر اس وقت تک صورتِ حال اتنی خراب نہ تھی جتنی کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ہوگئی تھی کہ داخلی متحارب قوتوں کے علاوہ انگریزوں کی شکل میں بدیسی استعمار بتدریج بنگال سے مغرب کی طرف پیش قدمی کرتا چلا آرہا تھا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے نصف تک مسلمانوں کی سیاسی قوت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ سیاسی اور عسکری میدانوں میں ہزیمت کے ساتھ ہی ان پر طرح طرح کے مصائب وآلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ایک طرف ہندو احیائی تحریکیں ابھرنا شروع ہوگئیں تو دوسری طرف عیسائی مشنریوں نے جارحانہ انداز میں عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ ادھر انگریزی سرکار نے متعدد نئے ریاستی ادارے اور اقتصادی سانچے متعارف کرادیے جن کے ساتھ فوری طور پر مطابقت پیدا کرنا مسلمانوں کے لیے آسان نہ تھا۔ برِصغیر میں اسلامی دینی روایت، جن سیاسی اور معاشرتی اداروں سے قوت پاتی تھی، ان میں سے زیادہ تر تحلیل ہو کر رہ گئے اور یوں علما اور دینی ادارے، سیاسی اور معاشی سرپرستی کے مربوط نظام سے محروم ہوگئے۔

ان حالات میں علما اور مفکرینِ اسلام کو کئی طرح کے فکری چیلنجوں کا سامنا تھا۔ ایک طرف مسلمانوں کو سیاسی بقا اور اپنے معاشی مفادات کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا تو دوسری طرف انھیں اپنی دینی روایت اور جداگانہ تہذیبی تشخص کی حفاظت کے چیلنج کا سامنا تھا۔ بقول ڈاکٹر مبارک علی "جب قومیں انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہیں تو اہل دانش و فکر زوال کے اسباب اور وجوہات ڈھونڈنے میں مصروف ہو جاتے ہیں"[۵] چناں چہ برّصغیر میں مسلمانوں کے دینی اور فکری رہنماؤں کو پیش آمدہ صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ماضی کے لگے بندھے ڈھب سے ہٹ کر کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مسلمانوں پر جو افتاد آن پڑی تھی اس کے اسباب کی طرف نظریں دوڑائی گئیں تو اہلِ اسلام کو خود اپنی دینی روش پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ رائج الوقت مذہبی رسوم ورواج اور معاشرتی رویوں کا اسلام کی مستند اور بنیادی تعلیمات کے ساتھ تعلق موضوع بحث بنا۔ بنیادی اختلاف یہ تھا کہ کون سے مروجہ دینی رسوم و رواج اور اعتقادات مستند ہیں اور کون سے بدعت واضافہ۔[۶] اگر جدید علم الادیان(Religious Studies) کی اصطلاح میں بات کی جائے

۴– دیکھیے: خلیق احمد نظامی، **شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات** (دہلی: ندوۃ المصنفین، ۱۹۶۹ء)، ۵۷– ۶۰۔

۵– مبارک علی، **برّصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ** (لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ۹۔

6– For a succinct account of Muslim reform in the nineteenth century India See, Barbara Daly Metcalf, *Islamic Revival in British India: Deoband, 1860-1900* (Princeton: Princeton University Press, 1982), 46-86.

تو کہا جاسکتا ہے کہ 'معمول بہ مذہب'(Popular Religion) اور 'مستند مذہب'(Official Religion) کا فرق ابھر کر سامنے آگیا۔[۷] مگر اب ماضی کی طرح ان فکری سرگرمیوں کو مربوط کرنے کے لیے کوئی ادارہ جاتی نظام یا موثر قوت نافذہ کی حامل کسی سیاسی اتھارٹی کی پشت پناہی حاصل نہ تھی، اس لیے اصلاحِ احوال کی کوششوں کے نتیجے میں تقسیم اور افتراق کا پیدا ہونا بعید از قیاس نہ تھا۔

بر صغیر پاک و ہند کے اہل سنت مسلمانوں میں آج پائی جانی والی اکثر مسلکی شناختوں کی شروعات انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوئیں۔ عملی آغاز کچھ اس طرح ہوا کہ شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۸۲۰ء کی دہائی میں **تقویۃ الایمان** لکھی جس میں ہندوستانی مسلم معاشرے میں پائے جانے والے کچھ مذہبی رسوم ورواجات کو بدعت یا عقیدۂ توحید کے منافی قرار دیا گیا۔[۸] انھوں نے خود کہا تھا کہ "میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ آگئے ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً ان امور کو جو شرک خفی تھے شرک جلی لکھ دیا گیا ہے۔ ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت سے شورش ضرور ہو گی ۔۔۔ مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہو جائیں گے۔"[۹] ان کا شورش کا خدشہ تو درست ثابت ہوا مگر لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہو جانے کی امید نقش بر آب ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے کے تصور پر زور دینے کے لیے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ لکھا تھا کہ "اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن و فرشتہ جبرائیل علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے۔"[۱۰] اس کے جواب میں علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ ختم نبوت کا اعلان کر چکنے کے بعد اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر کوئی دوسرا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت تنزیہہ کے خلاف ہے، اس لیے ایسا ہونا ممتنع بالذات ہے۔[۱۱] یہ بحث مسئلہ امتناعِ نظیر اور امکانِ نظیر کے ناموں سے معروف ہوئی۔ بعد ازاں ۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۰ء کی

7– See, Pieter H. Vrijhof and Jacques Waardenburg (eds.) *Official and Popular Religion: Analysis of a Theme for Religious Studies* (The Hague: Mouton Publishers, 1979).

۸– مولانا اسماعیل شہید دہلویؒ، **تقویۃ الایمان** (مئوناتھ بھنجن، یوپی: مکتبہ نعیمیہ، س ن)، ۷–۱۸۔

۹– مولانا اشرف علی تھانویؒ، **ارواح ثلاثہ یعنی حکایات اولیاء** (کراچی: مکتبہ عمر فاروق، ۲۰۰۹ء)، ۶۷۔

۱۰– دہلوی، مرجع سابق، ۴۴۔

۱۱– عبد الشاہد خاں شروانی، "تعارف"، مشمولہ مولانا محمد فضل حق خیر آبادی، **باغی ہندوستان**، ترجمہ: عبد الشاہد خاں شروانی (لاہور: مکتبہ قادریہ، ۱۹۹۷ء)، ۱۱۷– ۱۱۹۔

دہائیوں میں مولانا نقی علی خان رحمۃ اللہ علیہ (والد مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ) امتناعِ نظیر کے بڑے مؤید کے طور پر سامنے آتے ہیں[۱۲] جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علما کے درمیان یہ ایک مستقل نظری اختلاف بن گیا۔ اس کے علاوہ بھی حیاتِ انبیابعد از وفات، غیر اللہ کو غائبانہ مدد کے لیے پکارنا، عرس، میلاد، گیارھویں، فاتحہ، رفع الیدین اور آمین بالجہر جیسے موضوعات پر علما کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ انیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں میں ایسے اختلافات مستقل مکاتب فکر کی شکل اختیار کرنے لگے جو بعد ازاں دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث مسالک کے نام سے معروف ہوئے۔ مسلمانان برصغیر پاک وہند تاریخ کے جس نازک موڑ سے گذر رہے تھے اس موقع پر ایسا افتراق ان کے لیے انتہائی خطرناک تھا۔ اس موقع پر جن بزرگان دین نے مصالحت کی کوشش کی ان میں سب سے نمایاں نام حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔[۱۳]

حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اوران کی وسعتِ نظر

آپ ہندوستان کے ضلع سہارن پور کے قصبہ نانوتہ میں صفر ۱۲۳۳ھ بمطابق دسمبر ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام امداد حسین تھا جسے بعد میں شاہ اسحاق مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے بدل کر امداد اللہ کر دیا تھا۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ دہلی چلے گئے اور نقشبندی سلسلے کے شیخ نصیر الدین الشافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت حاصل کی۔ بعد ازاں حضرت میاں نور محمد جھانجھوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے اور چشتی صابری سلسلہ کے مطابق سلوک کی تکمیل کی۔ اگرچہ آپ نے رواج کے مطابق درسی کتابوں کی تعلیم مکمل نہیں کی، تاہم ذاتی مطالعے سے علمی بصیرت حاصل کر لی تھی۔ اسرارِ شریعت وطریقت سے آگاہ تھے اور حدیث پر ان کی نظر گہری تھی۔[۱۴] ان کی فکر میں اتنی وسعت اور توازن تھا کہ متبحر علما میں بھی خال خال ہی ملے۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا علم اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے سامنے

12- Usha Sanyal, *Ahmad Riza Khan Barelwi: In the Path of the Prophet* (Oxford: Oneworld, 2009), 56-57.

۱۳- اس سلسلے میں ایک اور اہم نام پیر مہر علی شاہؒ کا ہے جنھوں نے **تصفیہ مابین سنی وشیعہ** لکھ کر شیعہ، سنی نزاع پر ایک متوازن اور معتدل موقف پیش کیا اور اتحاد بین المسلمین کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ دیکھیے، پیر مہر علی شاہ، **تصفیہ مابین سنی وشیعہ** (گولڑا، اسلام آباد: پاکستان انٹرنیشنل پرنٹرز، ۱۹۹۳ء)۔

۱۴- حکیم محمود احمد ظفر، **حیات حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ: امیر جہاد آزادی** (لاہور: الکتاب، ۲۰۰۶ء)، ۱۵-۱۶۔

علما کی حقیقت نہیں۔[۱۵] علم تصوف پر آپ کی کتاب **ضیاء القلوب** اگرچہ متوسط ضخامت پر مشتمل ہے مگر چشتی صابری سلسلے کے مصادر میں ممتاز مقام کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے نو چھوٹے چھوٹے رسائل تصنیف کیے۔ آپ کی تمام تصنیفات کو **کلیاتِ امدادیہ** کے نام سے اکھٹا شائع کر دیا گیا ہے جس کے کل صفحات کی تعداد ۲۲۴ بنتی ہے۔[۱۶] مگر آپ کی اصل روحانی اور علمی میراث آپ کے تربیت یافتہ علما اور مشائخ تھے۔ چناں چہ ان کے حلقۂ ارادت میں برِصغیر کے اپنے وقت کے چوٹی کے علما شامل تھے۔ اگرچہ علما کے درمیان آپ کی بات کو فوقیت دی جاتی تھی تاہم آپ نے صوفیانہ زندگی بسر کی۔

سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں دیگر مقامی قوتوں کے علاوہ علما نے بھی کردار ادا کیا تھا۔ علما اور صلحا کی ایک جماعت نے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو امیر بنا کر انگریزی حکومت کے خلاف شاملی کے مقام پر جہاد شروع کر دیا تھا۔ مجاہدین کی ابتدائی کامیابی کے بعد انگریز غالب آگئے۔ نتیجتاً جنگ آزادی میں شریک دوسرے طبقوں کی طرح علما بھی زیر عتاب آگئے۔ کچھ کو تو شہید کر دیا گیا، کچھ قید ہوئے اور بعض نقل مکانی کر کے انگریز کی گرفت سے بچ نکلے۔ اسی دوران حضرت امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۷۶ھ بمطابق ۱۸۵۹ء کو مکہ مکرمہ ہجرت کر گئے۔[۱۷] پہلے پہل تو وہاں بہت عسرت اور تنگ دستی میں زندگی بسر ہوئی، مگر بعد ازاں اللہ تعالی نے آسانی اور فراوانی عطا فرمائی۔ مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران بھی آپ ہندوستان میں رہ جانے والے مریدین کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہے۔[۱۸] عموماً یہ رابطہ بذریعہ خط و کتابت ہوتا تھا۔ علما، شاگردوں اور مریدین سے جس محبت سے وہ پیش آتے تھے اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے قیام مکہ مکرمہ کے دوران اپنے متوسلین کے نام لکھے۔[۱۹]

اس زمانے میں مکہ مکرمہ متعدد ممالک سے آنے والے مسلمانوں کے لیے باہمی میل جول کا ایک

۱۵– تھانویؒ، **ارواحِ ثلاثہ**، ۱۵۱۔

۱۶– حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، **کلیاتِ امدادیہ** (کراچی: دارالاشاعت، ۱۸۷۶ء)۔

۱۷– محمود احمد ظفر، **حیات حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ**، ۹۵–۱۱۸۔

۱۸– آپ کے مختصر مگر مستند حالات زندگی کے لیے دیکھیے: عبد الحئ الحسنی، **الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام يعني نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر** (رائے بریلی: دار عرفات، ۱۹۹۳ء)، ۸: ۷۹–۸۱۔

19– Moin Ahmad Nizami, "Haji Imdadullah and the Chishti-Sabri Order in the Nineteenth Century North India" in *Sufism: A Celebration of Love* eds. Ajeet Cour, Noor Zaheer, Refaqat Ali Khan (New Delhi: Foundation of SAARC Writers and Literature, 2012), 194.

ذریعہ بن چکا تھا۔ عالم اسلام کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مسلمان اپنے ہاں پائے جانے والی استعمار کی چیرہ دستیاں بیان کرتے جس سے مسلم آفاقیت اور وحدت امت کے تصورات کو مہمیز ملی۔ گویا مکہ مکرمہ میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو وہ سیاسی، علمی اور ثقافتی ماحول مل گیا جو انھیں درکار تھا۔ اسی زمانے میں برصغیر کی ایک اور اہم علمی شخصیت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہندوستان سے آ کر مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیات نے وہاں ایک ایسی اسلامی آفاقیت کی بنیاد ڈالی جو مختلف اسلامی مسالک اور صوفی سلاسل میں پل کا کردار ادا کرتی تھی۔[۲۰] مکہ مکرمہ کے اس خاص آفاقی ماحول کی بدولت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بہت فکری توسع پایا جاتا تھا۔[۲۱] حال ہی میں ہارورڈ یونیورسٹی سے چھپنے والی ایک کتاب میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ متعدد سلاسلِ تصوف میں بیعت اور تربیت بھی آپ میں رواداری کا جذبہ پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔[۲۲] آپ نے تصوف میں اعتدال کے ساتھ اصلاح کی راہ اپنائی اور مختلف مکاتب فکر میں توافق کو اپنے اصلاحی پروگرام کا بنیادی حصہ بنایا۔[۲۳] آپ ایک طرف شاہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کے توسط سے شاہ ولی اللہی تحریک اور عملی جہاد کے علم بردار تھے[۲۴] تو دوسری طرف نقشبندی اور چشتی تصوف کی روایات کے امین۔ گویا آپ کی شخصیت علوم شریعت اور معارف طریقت کا حسین امتزاج تھی۔

مختلف اسلامی مکاتب فکر کے معاملے میں وہ صلحِ کل کے مویّد نظر آتے ہیں۔ گو سلفی مکتبِ فکر کے بارے میں وہ کبھی کبھار اپنے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں[۲۵] مگر اس ضمن میں بھی ادبِ اختلاف اور وسعتِ

20– Seema Alavi, *Muslim Cosmopolitanism in the Age of Empire* (Cambridge Massachusetts, Harvard University Press, 2015), 225-226.

۲۱– آپ کے توسع پر ایک مختصر مگر جامع بیان کے لیے دیکھیے: نثار احمد فاروقی "مقدمہ"، مشمولہ حاجی امداد اللہ فاروقی چشتیؒ، **نوادرات امدادیہ** (گلبرگہ، کرناٹک: حضرت سید محمود گیسودراز تحقیق اکیڈمی، ۱۹۹۶ء)، ۳۹–۴۰۔

22– Seema Alavi, *Muslim Cosmopolitanism in the Age of Empire*, 232.

23– Moin Ahmad Nizami, "Haji Imdadullah and the Chishti-Sabri Order in the Nineteenth Century North India", 196.

۲۴– ضیاء تسنیم بلگرامی، **روشنی کے مینار** (کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، ۲۰۰۴)، ۴۴۷–۴۵۱۔

۲۵– مثلاً دیکھیے: حاجی محمد امداد اللہ فاروقی چشتیؒ، **نوادرات امدادیہ** (گلبرگہ، کرناٹک: حضرت سید محمود گیسودراز تحقیق اکیڈمی، ۱۹۹۶ء)، ۱۰۳۔

نظر کو بالاے طاق نہیں رکھتے۔ مثلا ایک غیر مقلد صاحب[۲۶] اس شرط کے ساتھ ان سے بیعت ہو گئے کہ اپنا مسلک نہ چھوڑیں گے پھر چند دن بعد خود ہی آمین بالجہر اور رفع یدین چھوڑ دیا۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں بلا کر فرمایا بھائی اگر تمھاری راے بدل گئی ہے تو کوئی بات نہیں کہ دونوں طرح سے نماز پڑھنا سنت ہے، لیکن اگر محض اپنے پیر کی خاطر چھوڑ دیا ہے تو میں اپنے اوپر ترکِ سنت کا بوجھ نہیں لینا چاہتا۔[۲۷]

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مصالحانہ کاوشیں

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، برِ صغیر میں انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں ہی میں کچھ مذہبی رسوم ورواج اور چند ایک نظری مباحث میں اختلافات ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے، اگرچہ ابھی باقاعدہ مسلکی شناختیں وجود میں نہ آئی تھیں، مگر ناخوش گوار بات یہ ہوئی کہ خود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارادت مند علما ان مسائل میں اختلافات کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف مولانا احمد حسن کانپوری رحمۃ اللہ علیہ، شاہ عبد الحق مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبد السمیع میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو مولود، عرس اور نداء غیر اللہ جیسی مذہبی روایات کے مؤیّد تھے، جب کہ دوسری طرف مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو ان امور سے منع کرتے تھے۔[۲۸] ہوا یوں کہ ۱۸۸۵ء میں علماے دیوبند، گنگوہ اور کچھ اہل حدیث علما کی طرف سے مطبع ہاشمی میرٹھ سے یکے بعد دیگرے دو فتاویٰ شائع ہوئے جن میں میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم، عرس اور فاتحہ وغیرہ کو بدعت قرار دیا گیا۔ اس کے جواب میں مولانا عبد السمیع رامپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سال **انوار ساطعہ در بیان مولود و فاتحہ** لکھی اور مولود منانے کا بھرپور دفاع کیا۔ اس کتاب کے جواب میں مولانا خلیل احمد انبیھٹوی رحمۃ اللہ علیہ نے **براہین قاطعہ** لکھی۔ ان کتابوں میں ایک دوسرے کے خلاف سخت زبان استعمال کی گئی تھی۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا عبد السمیع رامپوری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کو پسند کیا، مگر اس کی زبان کو نرم کرنے اور دوسرا نقطہ نظر رکھنے والے پیر بھائیوں پر نام لے کر کی گئی طعن و تشنیع کو حذف کرنے کی تلقین کی جو انھوں نے

۲۶– یاد رہے کہ وہ اہل حدیث صرف محدثین کو مانتے ہیں اور اس نام سے معروف عصری مکتبِ فکر کا ذکر غیر مقلدین کے نام سے کرتے ہیں۔

۲۷– تھانویؒ، **ارواح ثلاثہ**، ۱۴۵– ۱۴۶۔

۲۸– دیکھیے: مولانا جمیل احمد تھانویؒ، **شرح فیصلہ ہفت مسئلہ** (لاہور: جامع اشرفیہ، تاریخ ندارد)، ۱۰۱۔

۱۸۹۰ء کی اشاعت میں حذف کر دی ۔[۲۹] اسی طرح کی نصیحت انھوں نے مولانا خلیل احمد انبیٹھوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی کی اور انھیں لکھا کہ اختلافی مسائل کو مشتہر نہ کریں اور ان کے قائلین کو گمراہ اور گمراہ کرنے والا قرار نہ دیں۔[۳۰] حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس صورتِ حال سے بہت رنجیدہ رہتے تھے اور بذریعہ مراسلت اپنے متوسلین کو باہمی نزاع سے بچنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مکتوب میں لکھا: "صحیفہ شریفہ پہنچا وہاں کے حال سے اطلاع ہوئی پیرزادوں کی پرخاش اور قحط بارش اور لامذہب اور بدعات کے غلبہ کے معلوم ہونے سے رنج ہوا خداوند تعالی رحم فرمائے اور ان بلاؤں سے مخلوق کو نجات بخشے۔"[۳۱] حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مریدوں کی باہمی چپقلش کو قحط اور لامذہبیت جیسی آفات کی طرح ناپسند کر رہے ہیں۔ مولانا عبدالسمیع رام پوری رحمۃ اللہ علیہ کو میں ایک مکتوب میں یوں نصیحت کی: "آپ لوگوں کے اختلاف کا ایسا غم و رنج ہے کہ ہمیشہ اس کے باعث دل منقبض و پژمردہ رہتا ہے اس لیے آپ لوگوں کو مناسب تھا کہ ہمارے غم و الم کے دور کرنے میں بدل مستعد و آمادہ ہو جاتے، میری رضامندی و خوشنودی کو حاصل کرتے۔"[۳۲]

اسی طرح حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کو مسئلہ مولود کے بارے میں لکھا:

مسئلہ مولود اختلافی ہے نفس ذکر مولود کے جواز میں کسی کو شک نہیں بلکہ مستحب ہے اور قیود زوائد جو روز بروز ہوتی جاتی ہیں البتہ موجب فساد فی الدین ہیں، اللہ تعالی سے دعا کرو کہ ان سے سب بھائی مسلمانوں کو بچاوے مولوی عبدالسمیع صاحب کو بھی فہمائش کی جائے۔ تم کو بھی مناسب ہے کہ اس میں چنداں تشدد نہ کرو کہ آپس میں نفسانیت بڑھ جاتی ہے بہتر ہے کہ آپس میں اتفاق رکھو خصوصا مسئلہ اختلافی میں آپس میں اختلاف کو راہ نہ دو۔ مولوی رشید احمد صاحب سے اس مقدمہ میں کہا گیا جو وہ فرمادیں اُس پر عمل کرنا چاہیے گویا کہنا فقیر کا ہے۔[۳۳]

صلح جوئی اور خیر خواہی کی جو روح اس مکتوب میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے وہ آپ کی تعلیمات میں جابجا نظر آتی ہے۔ حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کو ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں:

۲۹- نثار فاروقی، "مقدمہ"، ۱۱-۱۲۔ نیز دیکھیے: امداد اللہؒ، **نوادرات امدادیہ**، ۱۶۰-۱۶۲۔

30- Moin Ahmad Nizami, "Haji Imdadullah and the Chishti-Sabri Order in the Nineteenth Century North India",199.

۳۱- مولانا اشرف علی تھانویؒ، **مرقومات امدادیہ** (دہلی: مکتبہ برہان، ۱۹۷۹ء)، ۶۵۔

۳۲- امداد اللہؒ، **نوادرات**، ۱۳۴۔

۳۳- تھانویؒ، **مرقومات**، ۱۱۳۔

حق تعالی اپنے فضل سے وطن کے خرخشوں سے محفوظ رکھے مناسب ہے کہ حتی المقدور اختلافات و تکرارات سے کہ فی زمانہ موجود ہیں مجتنب رہیں (پرہیز کریں) اور خلوت و تنہائی کو دوست رکھیں مگر یارانِ طریقت سے اختلاط و محبت رکھیں۔۔۔اور مخالفین کے کلام پر صبر کریں اور جواب میں مشغول نہ ہوں۔[۳۴]

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس تلقین میں صوفیانہ صلحِ کل کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ صوفیا تعصب سے کوسوں دور رہتے ہیں، کیوں کہ علوم و رسومِ اسلام میں وہ فقہا اور محدثین کی پیروی کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو الصوفي لا مذهب له (یعنی صوفی کا اپنا کوئی خاص مسلک نہیں ہوتا۔)[۳۵]

چناں چہ مولانا عبد السمیع رام پوری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے بارے فرمایا کرتے تھے کہ میں حنفی المذہب اور صوفی المشرب ہوں۔ جن مسائل میں یہ دونوں گروہ متفق ہوں تو بلا چوں چرا ان کی پیروی کرتا ہوں۔ اگر کسی معاملے میں اختلاف نظر آئے تو دیکھتا ہوں اگر مسئلہ معارف و حقائقِ توحید سے تعلق رکھتا ہو تو صوفیاء کرام کی بات قبول کرتا ہوں کہ اس باب میں ان کا علم تحقیق کے ساتھ ساتھ کشف پر مبنی ہوتا ہے جبکہ دیگر علما محض نظر و فکر عقلی پر انحصار کر رہے ہوتے ہیں۔ ہاں اگر اختلاف مسائلِ عبادات و معاملات میں ہو تو دیکھتا ہوں اگر مسئلے کا تعلق عملِ جوارح سے ہو تو حنفی مذہب کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اگر اعمالِ قلب سے ہو تو صوفیاء کی طرف۔[۳۶] یعنی فقہی اور کلامی مسائل میں وہ فقہا اور صوفیا کی پیروی کرتے تھے؛ اپنا کوئی ایسا شخصی موقف نہ رکھتے تھے کہ اس کے دفاع اور حمایت کی فکر ہو۔

رسالہ 'فیصلہ ہفت مسئلہ' کی تالیف

جب اختلافات بڑھتے چلے گئے تو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالے، بنام **فیصلہ ہفت مسئلہ**، کے ذریعہ ایک معتدل راہ نکالنے کی سعی کی۔ آپ کو توقع تھی کہ اس سے کم از کم آپ کے حلقۂ ارادت سے وابستہ علما کے درمیان اختلاف رفع ہو جائے گا۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

یہ امر مسلمات سے ہے کہ باہمی اتفاق باعث برکات دنیوی اور دینی ہے اور آج کل بعض مسائل فرعیہ میں ایسا اختلاف واقع ہوا ہے جس سے طرح طرح کے شر اور دقتیں پیدا ہو رہی ہیں اور خواص کا وقت اور عوام کا دین ضائع

۳۴۔ نفس مرجع، ۱۰۷۔

۳۵۔ امداد اللہ مہاجر مکیؒ، **شمائم امدادیہ** (شاہ کوٹ: کتب خانہ شرف الرشید، ۲۰۰۷ء)، ۲۷-۲۸۔

۳۶۔ مولانا محمد عبد السمیع سہارن پوریؒ، **انوارِ ساطعہ در بیان مولد و فاتحہ**، تسہیل و تحقیق، محمد افروز قادری چریا کوٹی (چریا کوٹ، یوپی: ادارہ فروغ اسلام، ۲۰۱۰ء)، ۵۶۶-۵۶۷۔

ہو رہا ہے۔۔۔ یہ حالت دیکھ کر نہایت صدمہ ہوتا ہے اس لیے فقیر کے دل میں آیا کہ مسائل مذکورہ کے متعلق مختصر سا مضمون قلم بند کر کے شائع کر دیا جائے۔ امید قوی ہے کہ نزاع و جدال رفع ہو جائے۔[۳۷]

یہ رسالہ بلاشبہ اتحاد بین المسالک کی مساعی جمیلہ کے سلسلے میں ایک تاریخی مقام رکھتا ہے اور آج کے حالات کے پسِ منظر میں اس سے روشنی اخذ کی جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں نوجوان فاضل شیر علی ترین لکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں جب مسلمان اختلافی مسائل میں الجھے ہوئے تھے اور انگریز برصغیر پر اپنا تسلط جما رہا تھا تو حاجی صاحب نے دس صفحات کے اس رسالے کی مدد سے دیوبندی اور بریلوی اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی تاہم اپنی کوششوں میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن جس طرح کے عقائدی اختلافات نو آبادیاتی دور کے بعد شروع ہوئے ان کے پیش نظر اس رسالے کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور شاید جنوب ایشائی مسلمانوں کے لیے آج کے دور میں اس رسالے سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔[۳۸] ڈاکٹر خالد محمود کے نزدیک پاکستان کے سواد اعظم اہل السنۃ و الجماعۃ کو ایک کرنے کیلئے اٹھنے والی ہر آواز کا مرکزی پیغام یہی رہا کہ آؤ سب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر جمع ہو جائیں۔[۳۹] اسی طرح مولانا محمد عبد الستار خان نیازی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب **اتحاد بین المسلمین وقت کی اہم ضرورت** میں اتحادِ ملت کے لیے چار نقاط کا ذکر کرتے ہیں جن میں دوسرا نقطہ **رسالہ ہفت مسئلہ** کی پیروی ہے؛ آپ لکھتے ہیں:

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ چشتی صابری کی عظمت اور مرتبے کو سب لوگ تسلیم کرتے ہیں۔ تمام اکابر علماء دیوبند بالواسطہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں۔ برصغیر یا عالمِ اسلام میں جس قدر اختلافی مسائل پائے جاتے ہیں سب کا جامع و مانع حل انھوں نے پیش کر دیا ہے۔ اگر تمام مکاتبِ فکر کے عُلما اور متبعین حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف 'فیصلہ ہفت مسئلہ' کو حَکَم مان لیں تو فرقہ وارانہ اختلافات چشم زدن میں ختم ہو سکتے ہیں۔[۴۰]

یہ اقتباسات ایک طرف حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دیوبندی اور بریلوی ہر دو مکتب فکر کے نزدیک مقتدا ہونے کی حقیقت واضح کرتے ہیں، تو دوسری طرف **فیصلہ ہفت مسئلہ** کی اہمیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ مختصر یہ کہ

۳۷- امداد اللہ مہاجر مکیؒ، **فیصلہ ہفت مسئلہ** (لاہور: علماء اکیڈمی، محکمہ اوقاف، پنجاب، ۱۹۷۳ء)، ۶- ۷۔

38- Sher Ali Tareen. "Faysala Haft Mas'ala (A Resolution to the Seven Controverrsies)" *SAGAR: A South Asia Research Journal* 21 (2013) :5.

۳۹- ڈاکٹر خالد محمود، "مقدمہ"، مشمولہ حافظ محمد اقبال رنگونی، **حضرت حاجی امداد اللہؒ** (مانچسٹر: اسلامک اکیڈمی، ۱۹۹۹ء)، ۲۰۔

۴۰- محمد عبد الستار خان نیازیؒ، **اتحاد بین المسلمین وقت کی اہم ضرورت** (لاہور: مکتبہ رضویہ، ۱۹۸۴ء)، ۸۳۔

اتحاد امت اور مسلکی ہم آہنگی کے لیے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت، ان کی تعلیمات، اور خاص طور پر ان کے رسالہ **فیصلہ ہفت مسئلہ** کی اہمیت مسلمہ ہے۔

مسلکی ہم آہنگی کے موضوع پر گفت گو سے قبل رسالہ **فیصلہ ہفت مسئلہ** کی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نسبت اور اشاعت کے حوالے سے کچھ امور قابل ذکر ہیں۔ پہلی بار یہ رسالہ ۱۸۹۴ء میں مطبع نظامی، کانپور سے شائع ہوا تھا اور اس کے مصنف کے طور پر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام "از افادات" کے طور پر مذکور تھا جس سے واضح ہوتا ہے کہ رسالہ بذاتِ خود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قلم سے نہیں لکھا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالے کی اشاعت کے چند سال بعد "ضمیمہ فیصلہ ہفت مسئلہ" لکھا اور اس رسالے سے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حقیقی مراد بیان کرنے کی کوشش کی، وہ لکھتے ہیں:

> بعد الحمد والصلوٰۃ، اشرف علی تھانوی خادم آستانہ حضرت شیخ المشائخ سید السادات و مولانا مرشدنا الحافظ الحاج الشاہ محمد امداد اللہ صاحب ضوعفت برکاتہم اپنے پیر بھائیوں اور دیگر ناظرین "فیصلہ ہفت مسئلہ" کی خدمت میں عرض رساہے کہ رسالہ ہفت مسئلہ جو بباعث اس کے کہ بوجہ ضعف قوی جسمانیہ حضرت ممدوح کو خود قلم سے لکھنے میں تکلف ہوتا ہے۔ بحکم حضرت ممدوح بعبارات اس خادم کے بغرض محاکمہ بعض مسائل تحریر ہو کر تقریباً عرصہ چار سال کا ہوا کہ شائع ہوا ہے۔[۴۱]

اس تصریح کے بعد وہ اختلافی امور پر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی موقف کی وضاحت پیش کرتے ہیں۔ خود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۹۸ میں لکھے گئے ایک مکتوب میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھتے ہیں کہ **فیصلہ ہفت مسئلہ** ضمیمہ شدہ ابھی تک انھیں موصول نہیں ہوا[۴۲] جو ظاہر کرتا ہے کہ رسالے کے ساتھ ضمیمے کی اشاعت ان کے علم میں تھی۔ بہر حال فریق مخالف کی طرف سے مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے لکھی گئی وضاحتوں کو قبول کیا گیا، نہ ضمیمے کی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نسبت کو اور یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس ضمیمہ سے متعلق عدم رضا کا اظہار کیا تھا۔[۴۳] درحقیقت رسالے کی سند کے حوالے سے یہ ساری بحث اس لیے پیدا ہوئی کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اختلافی امور کے بارے میں پیش کردہ آرا کی

۴۱۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ، "ضمیمہ فیصلہ ہفت مسئلہ" شائع کردہ از مفتی رشید احمدؒ، **فیصلہ ہفت مسئلہ کی وضاحت** (کراچی: الرشید، ۱۹۹۹)، ۶۔

۴۲۔ امداد اللہ مہاجر مکیؒ، **مکتوبات امدادیہ** (لاہور: ادارہ اسلامیات، ۱۹۷۷ء)، ۵۳۔

۴۳۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ، **بوادر النوادر** (لاہور: ادارہ اسلامیات، ۱۹۸۵ء)، ۲۰۰۔

تشریح دونوں فریق اپنے اپنے انداز میں کرنے لگے اور رفع نزاع کی جو امید حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تھی وہ بوجوہ پوری نہ ہو سکی؛ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے ملفوظات، مکتوبات اور خاص طور پر ان کے رسالہ **فیصلہ ہفت مسئلہ** سے اتحاد بین المسلمین کے لیے ایسے آفاقی اصول اخذ کیے جاسکتے ہیں جن سے آج بھی استفادہ ممکن ہے۔ اگلے صفحوں میں اسی ضمن میں ایک طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے۔ تاہم یہاں یہ بتانا اہم ہے کہ محمد اسرار مدنی ادبِ اختلاف کے حوالے سے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات پر اجمالی طور پر روشنی ڈال چکے ہیں جو ایک قابل قدر کاوش ہے مگر انھوں نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے اور دو صفحات سے بھی کم جگہ میں نقاط (bullet points) کی صورت میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات کو آسان انداز میں جمع کر دیا ہے۔[۴۴] اس مقالے میں زیر بحث موضوع پر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کا ممکن حد تک بالاستعیاب مطالعہ، درجہ بندی، تفہیم، اور تحلیل و تجزیے کی کوشش کی گئی ہے جس میں کسی حد تک ثانوی مصادر پر بھی انحصار کیا گیا ہے۔

مسلکی ہم آہنگی کے لیے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا منہج

۱- اختلافات کا حصر اور درجہ بندی

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رفع نزاع کو جب باقاعدہ موضوع بنا کر رسالہ **فیصلہ ہفت مسئلہ** تصنیف کیا تو سب سے پہلے اختلافات کا حصر کیا اور ان کی درجہ بندی کی تاکہ مربوط طریقے سے مسائل کو سمیٹنے میں آسانی رہے۔ جیسا کہ رسالہ **فیصلہ ہفت مسئلہ** کے عنوان سے ہی ظاہر ہے اس میں جن اختلافی مسائل پر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گفت گو فرمائی، وہ سات ہیں جو کہ درج ذیل ہیں: مولود شریف، عرس وسماع، فاتحہ، نداء غیر اللہ، جماعت ثانیہ، امکان نظیر اور امکان کذب۔ ان میں سے کچھ مسائل پر وہ پہلے ہی اظہار خیال کر چکے تھے اور اپنے متوسلین کو اختلاف کو مخالفت میں نہ بدلنے کا مشورہ دیتے تھے۔

اب رسالے میں ان مسائل کا حصر کرنے کے بعد ایک سادہ سی تقسیم تجویز کرتے ہیں: مذکورہ مسائل میں سے پانچ عملی اور دو علمی ہیں اور جن مسائل میں زیادہ اختلاف تھا ان کو پہلے بیان کیا۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ پہلے پانچوں مسائل جو بیان کیے گئے ہیں وہ سب عملی اور بقیہ دو مسائل علمی ہیں۔ اس سے ابتدائی

۴۴- محمد اسرار مدنی، **راہ اعتدال** (لاہور: کل مسالک علماء بورڈ، س ن)، ۳۱-۳۲۔ انھی نکات کو حاجی صاحبؒ کے ایک مختصر تعارف کے ساتھ **مکالمہ** نامی ویب سائٹ پر ۲۳/ اکتوبر ۲۰۱۷ کو دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ دیکھیے:
https://www.mukaalma.com/11768، ویب سائٹ پر دیکھنے کی تاریخ، ۳۱/ دسمبر، ۲۰۱۷۔

طور پر ایک نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اختلاف اپنی ابتدائی شکل میں نظری سے زیادہ عملی تھا اور یہ نتیجہ اس لیے بھی قرین قیاس لگتا ہے کہ اکثر مذاہب میں نظری افتراق عملی اختلاف سے شروع ہوا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر شیعہ سنی اختلاف بھی اپنی اصل کے اعتبار سے خلافت جیسے عملی مسئلے سے تعلق رکھتا تھا مگر بعد ازاں اس کو الٰہیاتی رنگ دے دیا گیا۔[۴۵] بہر حال یہاں یہ بھی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ جن مسائل کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عملی گردانا در حقیقت ان کے پیچھے بھی عقیدے کا پہلو پایا جاتا تھا، مثلاً نداء غیر اللہ کا معاملہ بظاہر تو عملی ہے مگر اس کے پیچھے بھی غیر اللہ کو حاضر وناظر جاننے جیسے عقیدے کے مسائل پنہاں ہیں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جن سات مسائل کو مرکزی مانا ہے بعد کے بریلوی، دیوبندی افتراق میں ان میں سے کچھ کی حیثیت بالکل ثانوی ہو چکی ہے، جیسا کہ جماعت ثانیہ یا فاتحہ کا مسئلہ۔ اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں؛ ایک یہ کہ ضروری نہیں کہ جو اختلافات حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ارادت مند علما میں نظر آئے صرف وہی بریلوی دیوبندی افتراق کا باعث بنے، دوسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اختلاف کی نوعیت وہ نہ رہی جو ابتداء میں تھی۔

۲- صلح جو خود فریق نہ بنے

ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود اختلافی مسائل میں ایک مستقل فریق کے طور پر قیل و قال کے روادار نہ تھے، چناں چہ انھوں نے بلا تکلف اور صراحت کے ساتھ **فیصلہ ہفت مسئلہ** میں لکھ دیا کہ "کوئی صاحب اس تحریر کے جواب کی فکر نہ کریں کہ مقصود میرا مناظرہ کرنا نہیں۔"[۴۶] چناں چہ مولانا نذیر احمد خان رحمۃ اللہ علیہ کو ایک خط میں لکھا کہ "آئندہ نزاعی تحریرات میں فقیر سے استفسار نہ کیا جاوے ورنہ جواب سے فقیر قاصر رہے گا۔"[۴۷] حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بارے یہ بھی کہا کہ "مجھ کو ہر شخص اپنے مشرب اور مذاق کے موافق جانتا ہے، حالاں کہ میرا مذاق اطلاق ہے۔ میری مثال پانی کی سی ہے جس میں کوئی رنگ نہیں مگر جس رنگ کی بوتل میں بھرو اس کا ہم رنگ نظر آتا ہے۔"[۴۸] اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ جھنڈا

۴۵- دیکھیے: ابو زہرہ مصری، **اسلامی مذاہب**، ۳۱۔

۴۶- امداد اللہؒ، **فیصلہ ہفت مسئلہ**، ۷۔

۴۷- امداد اللہؒ، **نوادرات امدادیہ**، ۹۶-۹۷۔

۴۸- اشرف علی تھانویؒ، **کمالات امدادیہ** (لاہور: مکتبہ الفرقان، س ن)، ۴۷۔

تو اتحاد و اتفاق کا تھامے ہوتے ہیں مگر اصل میں وہ اپنے نقطۂ نظر یا مسلک کا پرچار کر رہے ہوتے ہیں۔ گاہے ایسا دانستہ ایک تکنیک کے طور پر کیا جا رہا ہوتا ہے اور گاہے معصومانہ غلط فہمی میں۔ یوں بات تو اتحاد و اتفاق کی دعوت سے شروع ہوتی ہے اور منتج مناظرانہ لٹریچر میں ایک نئے اضافے پر ہوتی ہے۔ اس سے عملی سبق یہ نکلتا ہے کہ جو کوئی بھی اتحاد بین المسلمین جیسے نیک مقصد کے لیے کمربستہ ہو وہ اس بات کا خیال رکھے کہ اس کی جدوجہد مسئلے کو حل کرنے کے بجائے مزید بگاڑ نہ دے۔

۳- 'الاولی فالاولی' کا اعتبار

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات سے جو اصول مستنبط کیا جاسکتا ہے وہ ہے، 'الاولی فالاولی' کا اعتبار۔ یعنی پہلے ان گروہوں میں تفاہم پیدا کرنے کی کوشش کرنا جو اصول و فروع میں ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔ چناں چہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ اختلافی مسائل تو اور بھی بہت ہیں، مگر انھوں نے ان سات مسائل کو گفت گو کے لیے منتخب کیا جن میں خود ان کے اپنے ارادت مند علما میں اختلاف سامنے آیا تھا، کیوں کہ طبعی طور پر انھیں عام مسلمانوں کی بہ نسبت اپنے معتقدین سے قبول کی امید زیادہ تھی۔ چناں چہ لکھتے ہیں: "ہر شخص سے امید قبول نہیں اور اپنی جماعت میں جو اختلافات ہیں اولاً وہ محدود، دوسرے امید قبول غالب۔" (۴۹)

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بنیادی ہدف یہ تھا کہ وہ لوگ جو رشد و ہدایت کے لیے ان پر اعتماد کرتے ہیں کم از کم ان کے اندر اختلاف و نزاع رفع ہو جائے۔ چناں چہ رقم طراز ہیں: "حق تعالیٰ سے امید قوی ہے کہ یہ تحریر باعثِ رفع فساد باہمی ہو جاوے، اور حضرات بھی اگر اس کو قبول فرما کر منتفع ہوں تو دعا سے یاد فرما دیں۔"(۵۰) چوں کہ انھیں اپنی کاوشوں سے کوئی غیر حقیقی توقعات نہ تھیں، اس لیے ان کی اولیں توجہ اپنے متوسلین پر تھی۔ یہاں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عمل قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے حکم **وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ** (۵۱) (اور اپنے

۴۹- امداد اللہؒ، **فیصلہ ہفت مسئلہ**، ۷۔

۵۰- نفسِ مصدر۔

۵۱- القرآن ۲۶: ۲۱۴۔

قریب کے دار رشتہ داروں کو ڈرائیں) اور فرمان رسولِ کریم ﷺ خیرکم خیرکم لأهله[۵۲] (تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل گھر والوں کے لیے اچھا ہو۔) سے اصولی مناسبت رکھتا ہے۔

عملاً دیکھا گیا ہے کہ کئی ایسے سطحی روشن خیال حضرات جو مکالمہ بین الادیان، وحدتِ ادیان اور مذہبی تکثیریت جیسی اصطلاحات کا ورد کرتے نہیں تھکتے، مگر جب معاملہ اپنے ہی ہم مذہبوں کا ہو تو معمولی نظری یا مسلکی اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ بھی ان کا نقطۂ نظر اور رویہ تعصب سے بھرپور ہوتا ہے۔

۴- اخلاص اور تواضع

اخلاص اور تواضع دین اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں اہم مقام رکھتے ہیں، مسلکی اختلافات ہوں یا دیگر معاملات، اخلاص ہر ایک کی بنیادی اکائی ہے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اتفاق باہمی کی اصل تواضع ہے جن لوگوں میں تواضع ہو گی ان میں باہم اتفاق رہے گا۔" [۵۳] اس قول میں اشارہ ہے کہ اکثر نظری اختلاف بظاہر معروضی نظر آتے ہیں، مگر حقیقت میں وہ اختلاف کرنے والوں کی انانیت، اور تکبر جیسے مہلک روحانی امراض کا شاخسانہ ہوتے ہیں۔ اکثر ایسے روحانی امراض کا شکار خود بھی اپنی بیماری سے آگاہ نہیں ہوتے اور حق گوئی اور اصولی موقف کی اوٹ میں اپنی شخصی رائے کی خاطر فتنے کی آگ بھڑکا دیتے ہیں، چوں کہ ایسے لوگ اپنے اوپر گمراہ کن دینی جوش طاری کر لیتے ہیں، اس لیے کوئی نصیحت بھی ان پر کم ہی اثر کر سکتی ہے۔ حاجی صاحب اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> مقبولیت ہر عمل کی عند اللہ و عند الناس صدق و اخلاص سے ہے۔ علامتِ اخلاص تحریر و تحقیق مسائل میں (یہ ہے کہ) حسنِ خُلق و لینت سے بغرضِ استفادۂ خلق ہو، کسی کا ساکت کرنا یا نقصان و عجز ظاہر کرنا (یا اپنے) فضل و برتری کا اظہار نہ ہو، نہ اپنے کلام کی تائید کے درپے ہو، نہ مجادلہ و نہ مراء ہو (جب کسی) کی رائے کسی حُجّت و دلائل کی وجہ سے اس کی تحقیق کے خلاف ہو تو اس سے ضد و بُغض و عناد نہ ہو اور نہ اس کی نسبت الفاظ توہین و تحقیر کے مستعمل ہوں۔[۵۴]

۵۲- محمد بن یزید القروینی، **سنن ابن ماجة**، ت، محمد فؤاد عبدالباقی، مصطفی الذہبی، کتاب النکاح، باب حسن معاشرة النساء (قاہرہ: دارالحدیث، ۲۰۱۰ء)، ۲: ۲۰۰، رقم: ۱۹۷۷۔

۵۳- تھانویؒ، **کمالات امدادیہ**، ۳۱۔

۵۴- امداد اللہؒ، **نوادرات امدادیہ**، ۱۰۱۔

عملی طور پر خود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سے متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جب ان پر دینی نقطۂ نظر سے اعتراض کیا گیا تو اپنا دفاع کرنے کے بجائے وہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ تنقید سنتے اور فوراً اپنے آپ کو اصلاح کے لیے پیش کر دیتے۔ مثلاً کسی نے آپ کے ایک شعر پر خلاف واقع ہونے کا اعتراض کیا تو شاعرانہ مبالغہ کی توجیہ کے باوجود کہہ دیا کہ غلطی ہو گئی ہے۔[۵۵] اپنے ہدایت پر ہونے کے لیے متفکر اور اس کے لیے دعا گو رہتے۔ چناں چہ ایک فاضل ان سے کسی موضوع پر بحث کرنے لگے تو آپ نے ان کو ہدایت کی دعا دی اس پر ان صاحب نے تنگ کر کہا اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت نہ دے، جواباً آپ نے فرمایا:

> یوں مت کہو ممکن ہے کہ آپ غلطی پر ہوں ہم تو اپنے لیے دعا کرتے ہیں کہ اگر ہم غلطی پر ہوں تو اللہ تعالیٰ ہم کو ہدایت دیں اور ہم سب کو چاہیے کہ نماز میں اھدنا کو بہت حضور قلب سے پڑھا کریں کہ ہدایت صراط مستقیم کی ہو کیونکہ ایسے امور خفیہ میں اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کون ہدایت پر ہے۔[۵۶]

۵- اتحاد و اتفاق کی کنجی حسنِ ظن

پھر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ایک اہم اصول مسلمانوں کے بارے میں عمومی حسنِ ظن کا ملتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں اچھا گمان رکھنا اور اپنے عیوب پر نظر رکھنا، اسلام کی اخلاقی اور روحانی تعلیمات کا ایک عمومی اصول تو ہے ہی مگر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات سے یہ روشنی ملتی ہے کہ یہی اخلاقی قدر اتفاقِ باہمی کی کنجی بھی ہے۔ مثلاً نداء غیر اللہ کے مسئلے پر گفت گو کرتے ہوئے **فیصلہ ہفت مسئلہ** میں لکھتے ہیں کہ "اگر پکارنے والا سمجھدار ہو تو اس پر حسنِ ظن کیا جائے اور محض عامی جاہل ہو تو اس سے دریافت کیا جائے۔ اگر اس کے عقیدے میں کوئی خرابی ہو تو اس کو بالکل روک دیا جائے۔"[۵۷] یعنی غیر اللہ کو پکارنے والا اگر عالم ہو تو حسن ظن رکھا جائے کہ وہ شرک نہیں کر رہا، بلکہ اس کے ہاں کوئی ایسی شرعی توجیہ موجود ہو گی جس کی رو سے کسی غیر موجود ہستی سے حاضر کے صیغے میں مخاطب ہوا جا سکتا ہے اور اگر عالم نہ ہو تو استفسار کر لیا جائے؛ اگر اس کے عقیدے میں کوئی خلاف شرع بات نظر آئے تو معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دیے بغیر صرف اس حد تک اصلاح کر دی جائے جتنی ضرورت ہو۔ اور اسی طرح مسئلہ سماع کی بحث کو سمیٹتے ہوئے ایک دوسرے سے حسنِ ظن رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو لوگ سماع کے مخالف ہوں ان کو سنت کا شائق سمجھیں اور جو

۵۵- تھانویؒ، **کمالات امدادیہ**، ۴۷۔

۵۶- نفسِ مصدر، ۴۲۔

۵۷- امداد اللہؒ، **فیصلہ ہفت مسئلہ**، ۳۴۔

سماع کے قائل ہیں ان کو اہلِ محبت میں سے جانیں۔ دونوں ایک دوسرے پر انکار نہ کریں اور عوام میں کوئی غلو در آیا ہو تو اس کو نرمی سے دور کریں۔[۵۸] در اصل حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں اس قدر حسنِ ظن تھا کہ کم ہی لوگوں میں ہوتا ہے؛ چناچہ جن کو لوگ کافر سمجھتے تھے،وہ کہتے: صاحب باطن ہے مگر غلطی ہو گئی۔[۵۹] اس ضمن میں شیر علی ترین لکھتے ہیں کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دینی تعبیر مصلحت عامہ اور عمل کرنے والے کی نیت پر انحصار کرتی ہے۔[۶۰] خلاصہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک اخلاص، تواضع اور دوسروں کے بارے حسنِ ظن جیسے اوصاف، کلامی اور الٰہیاتی موشگافیوں پر فوقیت رکھتے تھے۔

۶- حسب استطاعت صلح جوئی

پھر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ایک اصول یہ ملتا ہے کہ اختلافی امور میں اسی وقت اور اسی حد تک پڑا جائے جب اور جہاں اصلاح کی صورت نظر آ رہی ہو۔ چناں آپ فرماتے ہیں: "ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے جو بہت جگہ کارآمد ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی غلط عمل میں مبتلا ہو اور اس کے حالات کو دیکھ کر یہ یقین ہو جائے کہ یہ شخص اصل عمل کو ترک نہ کرے گا، تو اس موقع پر نہ تو اس کو اصل عمل کے چھوڑنے پر مجبور کرے، کیوں کہ سوائے فساد اور دشمنی کے اور کوئی نتیجہ نہ ہو گا اور نہ اس کو بالکل آزاد اور بے لگام چھوڑ دے، کیوں کہ یہ شفقت اوراخوّتِ اسلامی کے خلاف ہے، بلکہ اصل عمل کی اجازت دے کر اس میں جو خرابی ہو اس کی اصلاح کرے۔ اس میں قبول ہونے کی امید زیادہ ہے۔[۶۱] ان کے ہاں اس قاعدہ کے تین ذیلی پہلو ملتے ہیں:

(الف) اگر کہیں کوئی ایسی رسم شروع ہو جائے جو اصل میں تو دین کے خلاف نہ ہو مگر لازمی سمجھ لی جانے والی اضافی قیود کی وجہ سے بدعت کی شکل بن رہی ہو یا کچھ خلاف شرع امور ساتھ شامل ہو گئے ہوں تو رسم سے منع کرنے کے بجائے صرف غیر ضروری طور پر لازمی قرار دی گئی قیود یا غیر شرعی امور سے منع کر دینے سے قبولِ نصیحت کی زیادہ امید ہو گی بجائے اس کے کہ حکمت کو بالائے طاق رکھ کر

۵۸- نفس مصدر، ۳۰۔

۵۹- تھانویؒ، **ارواح ثلاثہ**، ۱۵۱۔

60- SherAli Tareen, "Normativity, Heresy, and the Politics of Authenticity in South Asian Islam," *The Muslim World* 99: 3 (2009): 541.

۶۱- امداد اللہؒ، **فیصلہ ہفت مسئلہ**، ۳۵-۳۴۔

کوئی فتوی لگادیا جائے اور نتیجہ یہ نکلے کہ لوگ ضد میں آکر غلطی پر اور بھی زیادہ ڈٹ جائیں۔ اس اصول کی تائید میں وہ استدلال کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت کی رسوم کی اصلاح کے سلسلے میں شریعت اسلامی میں یہی اصول مدِ نظر رکھا گیا تھا کہ ان رسوم کے اندر جو خرابی تھی اس کو دور کرکے ان کو باقی رہنے دیا گیا تھا۔[۶۲] ایک دفعہ انھوں نے کسی صاحب کو **حزب البحر** تجویز کی تو اس نے کہا کہ وہ تو بدعت ہے آپ نے نرمی سے کہا کہ اس میں تو جابجا آیات واحادیث ہیں انھیں کیسے بدعت قرار دیا جا سکتا ہے، تو ان صاحب نے کہا، اس میں اس طرح کے اشارات کہ یہاں انگلی بند کرو یہاں کھول لو نیز جو کلمات آیات و احادیث کے علاوہ ہیں وہ سنت سے زائد ہیں، تو آپ نے بحث کرنے کی بجائے کہا کہ اچھا اشارات اور آیات اور احادیث کے علاوہ کلمات کو چھوڑ کر پڑھ لیا کرو تو وہ صاحب مان گئے۔[۶۳]

(ب) اگر کسی رسم یا عقیدے میں عوام الناس کی طرف سے غلو در آیا ہو جس کی وجہ سے کچھ علما اس کے خلاف ہوں اور کچھ دوسرے علما اس کی تاویل کرتے ہوں، تو عوام الناس کو غلو سے روکنے کی ذمہ داری ان علما کو نبھانی چاہیے جو تاویل کی وجہ سے اس رسم یا عقیدے کی اجازت دے رہے ہوں۔ چناں چہ انھوں نے لکھا: مولد جیسے امور جن میں نزاع واقع ہوا ہے، ان میں عوام نے جو غلو اور زیادتیاں کرلی ہیں، ان سے رفق اور نرمی سے منع کیا جائے اور یہ منع کرنا ان علما کی طرف سے زیادہ مفید ہو گا جو خود مولد میں شریک ہوتے ہیں۔ جو علما مولد ہی سے منع کرتے ہیں اگر وہ مولد کے موقع پر ظاہر ہونے والے غلو کو منع کریں گے تو اثر ہونے کے امکانات بہت کم ہوں گے۔[۶۴] چند سال پہلے بریلوی مکتب فکر کے ایک اہم راہنما مفتی منیب الرحمٰن نے عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر منعقد کی جانی والی تقریبات کی تائید کرتے ہوئے اس موقع پر ہونے والی خلاف شرع باتوں پر ناصحانہ نکیر کی ہے۔[۶۵] ظاہر ہے کہ اس حوالے سے ان کی نصیحت کے اثر ہونے کا امکان کسی اہل حدیث یا دیوبندی عالم کی نسبت زیادہ ہو گا۔

۶۲- نفسِ مصدر، ۳۵۔

۶۳- حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ، "فیصلہ ہفت مسئلہ" در **کلیاتِ امدادیہ** (کراچی: دار الاشاعت، ۱۹۷۶ء)، ۲۱۔

۶۴- امداد اللہؒ، **فیصلہ ہفت مسئلہ**، ۱۶۔

۶۵- مفتی منیب الرحمٰن، "عید میلاد النبی کی شرعی حیثیت (آخری قسط)"، **روزنامہ دنیا**، ۱۴ جنوری، ۲۰۱۴۔

(ج) ایک اور عمومی قاعدہ پیش کرتے ہیں کہ جہاں اختلافی امور کی عادت ہو وہاں غیر مناسب انداز میں مخالفت نہ کریں اور جہاں عادت نہ ہو وہاں ایجاد نہ کریں، غرض یہ کہ جس طرح بھی ہو سکے فتنہ سے بچنے کی کوشش کریں۔ اس کی دلیل میں وہ حطیم کا ذکر کرتے ہیں۔[۶۶] جس کی تفصیل یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حطیم کے بارے پوچھا کہ کیا یہ بھی بیت اللہ میں داخل ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، پھر میں نے پوچھا کہ لوگوں نے اسے کعبے میں شامل کیوں نہ کیا؟ آپ نے فرمایا کہ تمھاری قوم کے پاس خرچ کم پڑ گیا تھا، پھر میں نے پوچھا کہ کعبہ کا دروازہ کیوں اونچا بنایا گیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ تمھاری ہی قوم نے کیا تاکہ وہ جسے چاہیں اندر آنے دیں اور جسے چاہیں منع کر دیں۔ اگر تمھاری قوم نے جاہلیت کو ابھی نیا نہ چھوڑا ہوتا اور مجھے ڈر نہ ہوتا کہ ان کے دلوں کو عجیب لگے گا تو میں حطیم کو کعبہ میں شامل کر دیتا اور کعبہ کا دروازہ زمین کے برابر کر دیتا۔[۶۷] یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ قریش کے احساسات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کعبہ شریف کو اس کی اصل شکل میں دوبارہ تعمیر فرمانے سے اجتناب فرمایا۔ چناں چہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ماننا تھا کہ جب خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنا کے خلاف کفار کے بنائے ہوئے کعبہ کو مصلحت اور فتنے سے بچنے کی خاطر اصلاح نہیں فرمائی تو ہمیں بھی لوگوں کے احساسات کو مد نظر رکھ کر دین کی تطبیق کرنی چاہیے تاکہ کسی قسم کا کوئی فتنہ پیدا نہ ہو۔[۶۸]

یہ اصول اور اس کی فروعات قرآن کریم کی اس آیت کے مطابق ہیں: ﴿اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ﴾ (سورة هود: ۸۸) (ترجمہ: میں تو بس حسبِ استطاعت اصلاح چاہتا ہوں، اور اللہ ہی مجھے توفیق دینے والا ہے اور اسی پر میرا بھروسہ ہے۔)

۷- اختلافات کے باوجود معاشرتی تعلقات بحال رکھنا

۶۶- امداد اللہؒ، **فیصلہ ہفت مسئلہ**، ۱۶-۱۷۔

۶۷- مسلم بن حجاج، **صحیح مسلم**، ت، محمد فؤاد عبدالباقی، کتاب الحج، باب جدر الكعبة وبابها (بیروت: دارإحياء التراث العربي، س ن)، ۲: ۹۷۳، رقم: ۴۰۵۔

۶۸- امداد اللہؒ، **نوادرات امدادیہ**، ۱۰۱۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اختلاف ونزاع کے باوجود ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا بھی درس دیا اور اس سلسلے میں تجویز کیا کہ اپنی تحقیق کے مطابق عمل کریں مگر "دوسرے فریق کے ساتھ بغض وکینہ نہ رکھیں نہ نفرت وتحقیر کی نگاہ سے اس کو دیکھیں نہ تفریق وتضلیل کریں۔۔۔ اور باہم ملاقات ومکاتبت وسلام وموافقت ومحبت کی رسوم جاری رکھیں اور تردید ومباحثہ سے، خصوصاً بازاریوں کے ہذیانات سے کہ منصب اہلِ علم کے خلاف ہے، پرہیز رکھیں۔"[۶۹] مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مکتوب میں لکھتے ہیں کہ مستقل قیام تو تھانہ بھون رکھیں مگر فرصت ملے تو کانپور جایا کریں اور وہاں کے احباب (جن سے مسائل میں اختلاف تھا) کی خبر گیری کرتے رہا کریں۔ مزید بتایا کہ کان پور کے احباب کو بھی ایسی ہی نصیحت کی گئی ہے۔[۷۰] اسی طرح مولانا عبد السمیع رام پوری رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا: "فقیر کی ہمیشہ سے یہ وصیت ہے کہ آپس میں اپنے قافلے کے ساتھ محبت و ربط ضبط کی ترقی میں کوشش فرماتے رہو۔۔۔ علماء دیوبند آپ سے ملنے کو آپ کے گھر میں آئے، آپ بھی اپنے مکان سے آتے جاتے وقت مدرسہ کے ملاحظہ کے بہانے، سب سے مل لیا کرو۔"[۷۱] یہ ایک سادہ مگر نہایت کارآمد اصول ہے، کیوں کہ باہم میل جول سے جو انس اور مناسبت پیدا ہوتی ہے اس میں اختلافی امور کو دیکھنے کا بنیادی زاویہ ہی بدل کر مثبت کر دینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ آج کل مکالمہ بین المذاہب میں باہمی میل جول کا اصول ایک اساسی قاعدہ بن چکا ہے۔

۸- مجلسی آداب کا لحاظ

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی تجویز کیا کہ ایک دوسرے کی رعایت کرتے ہوئے گاہے بگاہے دوسرے فریق کے موقف کے مطابق بھی عمل کر لیا جائے۔ مثلاً مولد پر مروجہ قیام کے بارے میں فرماتے ہیں: اگر کوئی ایسا عالم مجلس میں شریک ہو جو قیام سے منع کرتا ہو تو اس کی رعایت کرتے ہوئے قیام نہ کیا جائے۔ اسی طرح اگر کسی موقع پر قیام ہو رہا ہو تو جو اس کا قائل نہ بھی ہو تو مجلسی آداب کا لحاظ کرتے ہوئے قیام میں شریک ہو جائے۔[۷۲] ہو سکتا ہے کہ کچھ حضرات کو ایسی تلقین اس وجہ سے نامناسب لگے کہ یہ تو احقاق حق کے خلاف ہے، مگر یہاں اس بات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ جن معاملات میں علما کے ہاں نظری اختلاف پایا جاتا ہو، ان

۶۹- امداد اللہؒ، "فیصلہ ہفت مسئلہ" در **کلیاتِ امدادیہ**، ۸۰۔

۷۰- امداد اللہؒ، **مکتوبات امدادیہ**، ۵۵۔

۷۱- امداد اللہؒ، **نوادرات امدادیہ**، ۱۶۲۔

۷۲- امداد اللہؒ، "فیصلہ ہفت مسئلہ" **در کلیاتِ امدادیہ**، ۸۰۔

میں کسی ایک رائے کو حتمی طور پر حق قرار دے کر اس پر ڈٹ جانا، اکثر غیر ضروری تشدّد، کوتاہ بینی اور خود پسندی کے سبب ہوتا ہے۔

۹۔ وسعتِ نظر کی ضرورت

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس قدر نظر وسیع ہوتی ہے اسی قدر اعتراض کم ہو جاتا ہے۔[۷۳] اس کو واضح کرنے کے لیے وہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی **مثنوی معنوی** سے کچھ اشعار کا حوالہ بھی دیتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ اگر باطنی بصیرت حاصل ہو اور کسی مسئلے کی تمام جہتیں پیش نظر رہیں تو اختلاف اور فتنہ رفع ہو جائے۔ اکثر تفرقہ میں پڑے ہوئے لوگوں کی مثال ان لوگوں کی طرح ہوتی ہے جو اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر ہاتھی کے بارے میں رائے قائم کر رہے ہوں کہ جس کا ہاتھ ہاتھی کے جس عضو پر پڑتا ہے اسی کو ہاتھی سمجھتا ہے حالاں کہ حقیقت میں اس کو ہاتھی کے صرف ایک جزو کا علم ہوتا ہے۔[۷۴] تنگ نظری اور یک رخا پن اختلافات کا سبب بنتا ہے۔

۱۰۔ غیر ضروری نظری مسائل میں غور وخوض سے گریز

اتحاد بین المسلمین کے لیے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ایک اہم اصول یہ نظر آتا ہے کہ غیر ضروری تنازعات میں نہ پڑا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ علما تنازع میں پڑ کر العلم هو الحجاب الأكبر (حق کے پہچاننے میں علم ہی سب سے بڑا حجاب ہے) کے مصداق بن جاتے ہیں۔[۷۵] یہ اصول ان کے رسالے میں یوں سامنے آتا ہے کہ عملی مسائل میں تو کسی قدر تفصیل سے گفت گو کی گئی ہے اور جہاں مناسب جانا اپنا مشرب اور عمل بھی بیان کر دیا ہے مگر محض نظری مسائل میں گفت گو میں نہایت ہی اختصار سے کام لیا گیا ہے اور دونوں علمی اختلافات جن کو ہفت مسئلہ میں شامل کیا ان کو ایک ہی مبحث میں اکٹھا کر کے اجمالی طور پر یہ نصیحت کر دی ہے: اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قادر بھی ماننا چاہیے اور تمام عیوب ونقائص سے پاک بھی جاننا چاہیے۔ باقی اس طرح کی نظری بحثوں میں پڑنا کہ کیا اللہ تعالیٰ، نبی اکرم ﷺ کی نظیر پیدا فرما سکتا ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ سے

۷۳۔ اشرف علی تھانویؒ، **کمالات اشرفیہ (ملفوظات حکیم الامت)**، مرتبہ، مولانا محمد عثمان (ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۲۰۰۹ء)، ۸۵۔

۷۴۔ امداد اللہؒ، "فیصلہ ہفت مسئلہ" **در کلیاتِ امدادیہ**، ۸۶۔

۷۵۔ امداد اللہؒ، **شمائم امدادیہ**، ۴۵۔

جھوٹ کا صدور اس کی قدرت میں شامل ہے یا نہیں، تو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عجب نہیں کہ ایسے نازک مسائل میں قیل و قال کرنا منع ہو جیسے کہ تقدیر کے مسئلے پر گفت گو کرنے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا تھا۔[۷۶] مختصراً یہ کہ اس طرح کے مسائل کہ جن میں غور و خوض کے ہم مکلف نہیں ہیں ان سے جتنا ہو سکے اجتناب کرنا چاہیے۔

۱۱- علمی اختلاف کو علما تک محدود رکھنا

ان کا ماننا یہ تھا کہ "آج کل بعض مسائل فرعیہ میں ایسا اختلاف واقع ہوا ہے جس سے طرح طرح کے شرور و فتن پیدا ہو رہے ہیں اور خواص کا وقت اور عوام کا دین ضائع ہو رہا ہے۔"[۷۷] نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ خواص یعنی علما کا دین ضائع ہو رہا ہے، کیوں کہ ان کے نقطۂ نظر سے اکثر امور میں نزاع لفظی تھا اور مقصود سب کا متحد اور اچھا تھا۔ ہاں وہ اس بات سے ضرور آگاہ تھے کہ عوام ان نزاعی امور کے سبب گمراہی میں پڑ سکتے ہیں اور ان کا دین ضائع ہو سکتا ہے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا موقف تھا کہ علمی اختلاف کو علما تک محدود رہنا چاہیے، چناں چہ مولانا خلیل احمد انبیٹھوی رحمۃ اللہ علیہ مصنف **براہین قاطعہ** کو لکھے ایک خط میں نصیحت کرتے ہیں: "عزیزم، کوئی ایسا مسئلہ جس سے عوام کا فہم اس کی تفہیم سے قاصر ہو یا کوئی نقصان و فتنہ کا خوف ہو یا بہ نسبت فائدہ کے ضرر زیادہ متصوّر ہو، اس کو شائع کرنا خلاف مصلحت اور ممنوعِ شرع ہے۔"[۷۸] اس ضمن میں **فیصلہ ہفت مسئلہ** میں عملی تدبیر تجویز کرتے ہیں کہ اگر کوئی اختلافی مسائل میں گفت گو کرنا ضروری سمجھے تو زبانی اور نجی مجلس میں کرے اور اگر تحریر کرنا چاہے تو جس سے بات کرنا مطلوب ہو اس کو خط یا رسالہ لکھ دے نہ کہ کتابیں لکھ کر عامۃ الناس کے لیے شائع کراتا پھرے۔ مزید آگے فرماتے ہیں کہ کتاب لکھنے کا بھی شوق ہو تو عربی میں لکھ لے تاکہ عوام ایسے مسائل کی وجہ سے فتنہ میں نہ پڑیں۔[۷۹] اس ضمن میں ایک بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ اپنے مسلک کی اشاعت کی غرض سے ان پڑھ عوام یا ایسے تعلیم یافتہ حضرات جن کا دینی علم بمشکل واجبی سا ہوتا ہے ان کے سامنے ایسے نازک کلامی مسائل رکھ دیے جاتے ہیں جو ان کی سمجھ میں آنے والے نہیں ہوتے۔ نتیجتاً فتنے سر کنڈوں کی طرح نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔

۷۶- امداد اللہؒ، **فیصلہ ہفت مسئلہ**، ۳۹۔

۷۷- امداد اللہؒ، "فیصلہ ہفت مسئلہ" در **کلیاتِ امدادیہ**، ۷۷۔

۷۸- امداد اللہؒ، **نوادرات امدادیہ**، ۱۰۰-۱۰۱۔

۷۹- امداد اللہؒ، **فیصلہ ہفت مسئلہ**، ۳۹-۴۰۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی سے بچنے کی تلقین کر رہے ہیں۔

۱۲- صاحب حال اور صاحب قال کا فرق

اوپر بیان کردہ اصول سے قریبی طور پر تعلق رکھنے والا ایک اور اصول ان کے ہاں یہ ملتا ہے کہ ایسے معاملات جن کا تعلق اہل حال سے ہے ان میں اہلِ قال علما اور عوام کو زیادہ جرح وقدح نہیں کرنی چاہیے۔ مثلا ایک شخص کے پوچھنے پر بتایا کہ مسئلۂ وحدۃ الوجود حق اور واقع کے مطابق ہے "مگر قال اور اقرار نہیں ہے، البتہ حال و تصدیق ہے۔" (۸۰) نیز یہ بھی فرمایا کہ اس مسئلے میں قلبی یقین رکھتے ہوئے عوام اور علماے ظاہر سے اس کو چھپانا لازم اور ان کے سامنے اس کو کھولنا ناجائز ہے، کیوں کہ اس مسئلے کے بیان میں اہل معرفت ایسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں، جنھیں عوام کیا علماے ظاہر بھی نہیں سمجھتے۔ یہاں تک فرمایا کہ ایسے صوفی بھی کہ جن کا سلوک ابھی مکمل نہیں ہوا ہوتا، جب وہ اس طرح کے مسائل میں پڑتے ہیں تو الحاد اور گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ (۸۱) بالفاظ دیگر صاحب حال کے معاملات میں صاحب قال کے لیے پوری تحقیق کے بغیر راے زنی کی بجائے خاموش رہنا زیادہ مناسب ہے۔

۱۳- سوادِ اعظم کی پیروی

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ اصول بھی ملتا ہے کہ اگر کسی فرد یا چھوٹے گروہ کی تحقیق اکثر اہل اسلام کے خلاف ہو تو اس کا وہ یوں پرچار نہ کریں کہ جو ان کے مطابق نہیں وہ گمراہ ہیں یا باطل پر ہیں۔ دوسری راے رکھنے والی اکثریت کا احترام کرنا چاہیے اور اگر کوئی امر غلط بھی لگ رہا ہو تو اس کی ہر ممکن اچھی تاویل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، بجائے اس کے کہ فتوے دینا شروع کر دے۔ چناں چہ مولانا نذیر احمد خان رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا:

> فقیر کا یہ مسلک ضرور ہے کہ اہل اسلام کی تکفیر پر جراءت نہیں کرتا، بلکہ اُس سے تنفّر قلبی رکھتا ہے اور اس میں صرفِ اوقات کو حماقت بلکہ خسران وخذلان کا موجب سمجھتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو تاویل کو محبوب سمجھتا ہے بشرطیکہ سوادِ اعظم کے خلاف نہ ہو اور فقیر صلح بین المومنین کا بدل خواہاں ہے اور اپنے احباب کو بھی فقیر کی یہی

۸۰- امداد اللہؒ، **شمائم امدادیہ**، ۳۰۔

۸۱- نفسِ مصدر، ۳۲-۳۰۔

نصیحت ہے کہ نزاع سے کنارہ کش رہیں اور مسائل مختلف فیہا میں سواد اعظم کا اتباع کریں، اگرچہ وہ مسئلہ اپنی تحقیق کے مخالف ہو کیونکہ سواد اعظم علما و مشائخ کا خلاف تنزل مرتبہ ایمانیہ کا موجب اور انحطاط کمالات کا مثمر ہے۔ (۸۲)

۱۴- خلاف اسلام مذاہب کے ساتھ مقابلے کو ترجیح دینا

انھوں نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ جہاں خلاف اسلام مذاہب پائے جاتے ہوں یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کا ماحول ہو تو ایسے معاشروں میں بطور خاص مسلمانوں کو اپنے باہم اختلافات بالاے طاق رکھ کر دفاع اسلام کے لیے کمربستہ ہو جانا چاہیے اور ایسی تقریبات یا اجتماعات جس میں اسلام یا نبی کریم ﷺ کے فضائل و محاسن بیان کیے جائیں ان کی مشروعیت کے بارے میں زیادہ جرح و قدح نہیں کرنی چاہیے۔ مولانا خلیل احمد انبیٹھوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

دیکھو ہندوستان میں سینکڑوں مذاہب کفریہ و عقائد باطلہ، مخالفِ دین و بیخ کن اسلام ظاہر ہوتے جاتے ہیں اور کیسے کیسے الزام و اعتراض و شبہات و شکوک مذہب اسلام پر وارد کیے جاتے ہیں کہ اُس سے ہزاروں (مسلمان) کوئی شبہ و شک میں، کوئی متردّد و متوہّم کوئی مرتد تک ہوتے جاتے ہیں (پس) آپ علما پر فرض ہے کہ آپس کے جھگڑوں سے کنارہ کر کے سب متفق ہو کر اُن کے (شکوک) و شبہات کو دینِ اسلام پر سے اٹھا کر خلق کو اطمینان و تشفّی دیتے رہیں۔۔۔اور قرآن شریف کی خوبیاں و فضائل اور رسول اللہ ﷺ کے محامد و مکارم اخلاق و محاسن اوصاف کو ہر مقام و ہر شہر و قریہ میں نہایت زور و شور سے مشتہر کرنا چاہیے۔ (۸۳)

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کاوشوں کا نتیجہ

مسلکی ہم آہنگی کے لیے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے منہج کے علاوہ یہ دیکھنا بھی بہت اہم ہے کہ ان کی مصلحانہ کاوشوں کا کیا اثر مرتب ہو سکا؟ اس حوالے سے وہ خود متفکر تھے۔ رسالہ **فیصلہ ہفت مسئلہ** کی اشاعت کے اگلے برس یعنی ۱۸۹۵ء میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھے ایک مکتوب میں وہ پوچھتے ہیں: "پوری کیفیت تحریر کیجیے کہ کیوں کر باہمی صلح و وقوع میں آئی؟ واقعی نجات طرفین کو ملی یا ہنوز اندرونی خلش باقی رہی؟ خدا کرے فساد کی بیخ و بنیاد اڑ گئی ہو آمین۔" (۸۴) یوں لگتا ہے کہ اپنی خداداد فراست کی بدولت انھیں نظر آ رہا تھا کہ مسلمانوں کا باہمی تفرقہ رکنے کا امکان کم ہے جس کا اندازہ حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کو لکھے ایک مکتوب سے ہوتا

۸۲- محمد عبد السمیع سہارن پوریؒ، **انوارِ ساطعہ در بیان مولد و فاتحہ**، ۵۶۷۔

۸۳- امداد اللہؒ، **نوادرات امدادیہ**، ۱۰۳-۱۰۴۔

۸۴- امداد اللہؒ، **مکتوبات امدادیہ**، ۲۲۔

ہے۔ اس خط میں لکھتے ہیں: "عزیز من زمانہ فتنہ و فساد کا ہے، قربِ قیامت ہے، جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہو گا، کسی کے روکنے سے کب رکتا ہے۔ اپنی خیر مانگو جو کچھ ہو سکے عمل نیک کر لو۔"(۸۵)

چناں چہ بعد میں پیش آمدہ واقعات سے ثابت ہوا کہ ایسے خدشات درست تھے۔ چناچہ اگر وسیع تر تاریخی تناظر میں دیکھیں تو بد قسمتی سے ایسی عظیم کاوشوں کے باوجود برصغیر میں مسلمانوں میں ابھرتا ہوا تفرقہ ختم نہ ہو سکا، بلکہ بات اختلافات سے بڑھ کر تکفیر کے فتووں تک پہنچ گئی۔ یوں معاملہ اتنا بگڑا کہ آج تک برصغیر پاک وہند میں اہل سنت وجماعت بریلوی، دیوبندی (اور اہل حدیث) کی تقسیم کا ایسا شکار ہوئے کہ ان کی مساجد، مدارس، مدرسہ بورڈ، اشاعتی ادارے، سیاسی جماعتیں اور معاشرتی تنظیمیں سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ یہ تفریق اب اتنی گہری ہوگئی ہے کہ دینی اصطلاحات اور زبان تک ایک دوسرے سے مختلف ہونے لگی ہے۔ مثلاً دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والی تبلیغی جماعت میں 'نبی کریم ﷺ کے مبارک طریقے کی' اصطلاح کی جاتی ہے جب کہ بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والی دعوت اسلامی میں 'پیارے نبی ﷺ کی پیاری سنتیں' جیسی اصطلاح مروج ہے اور بریلوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والی طلبہ تنظیم انجمن طلباے اسلام کا نعرہ 'روحانی انقلاب' جب کہ دیوبندی نقطہ نظر سے نسبتاً قریب سمجھی جانے والی اسلامی جمعیت طلبہ کا نعرہ 'اسلامی انقلاب' ہے۔ اسی طرح آج زیادہ تر مساجد کے ناموں مثلاً 'جامع مسجد غوثیہ' اور 'جامع مسجد توحید' سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ یہ کس مسلک کے ماننے والوں کی مسجد ہے۔ باہم تفرقے کے یوں ادارہ جاتی شکل اختیار کر لینے سے اس تقسیم کے گہرا ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہاں اگر سوال کو یوں محدود کر لیا جائے کہ خود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے مرید علما نے کس حد تک ان کی نصیحت قبول کی اور اختلافی مسائل سے صرف نظر کیا تو اس میں کچھ تفصیل ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مولانا عبد السمیع رام پوری رحمۃ اللہ علیہ نے **انوار ساطعہ** کی درشت زبان کو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کی تکمیل میں اگلی اشاعت میں نرم کیا تھا۔ اسی طرح یہ بھی نوٹ کیا گیا ہے کہ جب مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اکابر علماے دیوبند کے خلاف کفر کے فتاویٰ جارے کیے تو علمی اختلافات کے باوجود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین علما مثلاً مولانا عبد السمیع رام پوری رحمۃ اللہ علیہ اور پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ اس مہم کا حصہ نہ بنے۔(۸۶) پیر مہر علی

۸۵- تھانویؒ، **مرقومات امدادیہ**، ۱۱۳۔

۸۶- حافظ محمد اقبال رنگونی، **حضرت حاجی امداد اللہؒ** (مانچسٹر: اسلامک اکیڈمی، ۱۹۹۹ء)، ۱۱-۱۲۔

شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ امتناع نظیر کی بحث میں شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے لکھا کہ دونوں فریق اللہ تعالیٰ سے اجر پانے والے ہیں کیوں کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔[۸۷] یعنی پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر دو فریق کی نیت اچھی تھی اور اس حسن ظن میں حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مشرب کی جھلک واضح ہے۔ اسی طرح قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نصائح کا اثر تھا کہ علماے دیوبند نے اپنے خلاف کفر کے فتاویٰ کے جواب میں مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے پیروکاروں کی تکفیر سے گریز کیا۔ بہر حال یہ واضح ہے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مصالحتی کاوشوں کا اثر ان کے اپنے متوسلین کی حد تک بھی اتنا نہ ہو سکا جتنا ہر دو فریق کے نزدیک متبوع شیخ کی حیثیت رکھنے کی وجہ سے توقع کی جاسکتی تھی۔ گویا حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین نے اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کی تکفیر سے تو گریز کیا، مگر اپنے اختلافات کو مستقل مسالک میں ڈھلنے سے نہ روک سکے۔ باہم مخالفت کی عمومی فضا میں رسالہ **فیصلہ ہفت مسئلہ** بذات خود مناظرانہ طبع آزمائی کا ایک موضوع بن گیا اور فریقین کی طرف سے رسالے کے مندرجات کو اپنے اپنے موقف کی تائید کے لیے استعمال کیا جانے لگا[۸۸] حالاں کہ جو کوئی بھی خالی الذہن ہو کر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمومی نصیحتوں اور **فیصلہ ہفت مسئلہ** کو سامنے رکھے تو اسے یہ جاننے میں دشواری پیش نہ آئے گی کہ ان اختلافی امور پر اپنا ذاتی موقف پیش کر کے منوانا، ان کا مطمع نظر نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں ان کی ساری گفت گو کا ماحاصل یہی ہے کہ کیسے اختلاف و نزاع سے بچا جاسکتا ہے۔

اب یہ سوال کہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ، جن کی حیثیت ہر دو فریقین کے ہاں آج تک مسلمہ ہے، ان کی صلح جوئی کی کوششیں کیوں ایک حد سے زیادہ بارآور ثابت نہ ہوئیں؟ ان کی واضح نصیحتوں اور مسلکی ہم آہنگی کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھنے کے باوجود اختلافات کیوں دور نہ ہو سکے اور فرقہ وارانہ شناختیں کیسے مزید گہری ہو گئیں؟ ایک وجہ تو یہ سمجھ آتی ہے کہ عالم اسلام کے دینی مرکز مکہ مکرمہ میں قیام پذیر

۸۷- پیر مہر علی شاہؒ، **فتاویٰ مہریہ** (گولڑا، اسلام آباد: کتب خانہ درگاہ غوثیہ مہریہ، ۲۰۱۰ء)، ۱۱۔

۸۸- دیوبندی موقف کی تائید میں رسالے پر لکھی گئی توضیحات کے لیے مثال کے طور پر دیکھیے: مفتی رشید احمد، **فیصلہ ہفت مسئلہ کی وضاحت** (کراچی: الرشید، ۱۹۹۹ء)؛ مولانا جمیل احمد تھانوی، **شرح فیصلہ ہفت مسئلہ** (لاہور: جامع اشرفیہ، س ن)؛ مولانا نعیم الدین، "حاصل مطالعہ: فیصلہ ہفت مسئلہ"، **ماہنامہ انوارِ مدینہ**، لاہور (جولائی ۱۹۹۸ء)۔ رسالے پر بریلوی نقطۂ نظر سے لکھی گئی تعبیرات کے لیے دیکھیے: مفتی محمد خلیل خان برکاتی، **فیصلہ ہفت مسئلہ مع توضیحات و تشریحات** (لاہور: فرید بک سٹال، ۱۹۸۶)؛ صوفی محمد عبد الشکور رضوی، **مسلک حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ** (نارووال: مکتبہ غوثیہ، س ن)۔

ہونا جہاں ایک طرف حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اسلامی آفاقیت اور ان کی روحانی اتھارٹی کو مہمیز کرتا تھا تو دوسری طرف ہندوستان سے دور ہونا، جہاں ان کے متبعین کی اکثریت تھی، ان کے مصالحانہ مشن میں ایک رکاوٹ ثابت ہوا کیوں کہ اس زمانے میں ذرائع آمد و رفت اور رسل رسائل اتنے عام نہ تھے۔ یوں نظر آتا ہے کہ جو کوئی ان کے پاس مکہ مکرمہ جاتا وہ ان کے سامنے خود اپنا اور فریقِ مخالف کا موقف پیش کرتا، جواباً حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو کچھ فرماتے، جب ہندوستان واپس جا کر اپنے اپنے انداز میں اسے عام کیا جاتا تو اس کی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نسبت اور ان کی حقیقی مراد پر سوال اٹھنے لگتے؟ یوں ان کی نصیحت کا اثر محدود ہو جاتا۔ غالباً یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خوب صورت تشبیہ کے ذریعہ اشارہ کیا تھا کہ ان کی مثال بے رنگ پانی کی سی ہے کہ اس کو جس رنگ کی بوتل میں ڈالا جاتا ہے اسی رنگ کا نظر آتا ہے۔[۸۹]

دوسرا ممکنہ سبب یہ رہا کہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابرِ دیوبند نے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے موقف سے کسی حد تک علمی اختلاف کیا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان سے ایک عرصے تک دور رہنے کی وجہ سے وہاں در آنے والی بدعات سے پوری طرح آگاہ نہ تھے اور امر واقع کی اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے کئی قابل مواخذہ امور کے بارے نرم موقف رکھتے تھے۔[۹۰]

خود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ علمی آرا میں اپنے مرید علما کے اختلاف کو خلاف ادب نہ سمجھتے تھے، مثلاً مکہ مکرمہ میں ایک مرتبہ وہ مولود کی محفل کے لیے جا رہے تھے تو مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ساتھ چلنے کا کہا، لیکن انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں ہندوستان میں اس سے منع کرتا ہوں، اس لیے یہاں میرا شریک ہونا مناسب نہیں تو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے اس جواب کو بخوشی قبول کر لیا۔[۹۱] مگر مولانا عبدالسمیع رام پوری رحمۃ اللہ علیہ نے جب انھیں لکھا کہ علماے دیوبند نے **فیصلہ ہفت مسئلہ** کو قبول نہیں کیا تو اس پر آپ نے جوابی مکتوب میں قدرے تاسف کا اظہار تو کیا، مگر پھر بھی انھیں یہی نصیحت کی کہ میاں تم اپنا کام کرو اور کسی کے افعال پر نظر نہ رکھو۔[۹۲]

بعض علماے دیوبند کا یہ بھی موقف تھا کہ شیخ کی اتباع کا تعلق باطنی اصلاح اور تربیت سے ہے نہ کہ

۸۹- تھانویؒ، **کمالات امدادیہ**، ۴۷۔

۹۰- تھانویؒ، **بوادر النوادر**، ۱۹۸۔

۹۱- تھانویؒ، **ارواح ثلاثہ**، ۲۳۸۔

۹۲- امداد اللہؒ، **نوادرات امدادیہ**، ۱۸۶۔

عقائد اور کلامی مسائل سے۔[۹۳] اس موقف کی علمی حیثیت سے قطع نظر اس کا عملی نتیجہ یہی نکلا کہ تواضع، حسن ظن اور صلح جوئی جیسی اقدار کو کلامی مسائل پر فوقیت دے کر اختلافات ختم کرنے کی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش کو زک پہنچی۔

تیسری ممکنہ وجہ یہ رہی کہ آپ کے مریدین کے درمیان اختلافات برصغیر کی عمومی مسلم دینی روایت میں در آنے والے تفرقے کا محض ایک جزو تھے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں نہ تھے وہ اپنی مناظرانہ مہم کو ترک کرنے پر آمادہ نہ تھے، اس لیے بھی اختلافات کی فضا ختم نہ ہو سکی مثلاً جس سال رسالہ **فیصلہ ہفت مسئلہ** کی اشاعت ہوئی اسی سال مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ **سل السیوف الہندیہ علی کفر بابا النجدیہ** (نجدی پیشواؤں کے کفریات پر لٹکتی ہندی تلواریں) لکھا تھا جس میں شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **تقویۃ الایمان** کو بطور خاص نشانہ بنایا گیا تھا، ایک دہائی بعد ۱۹۰۸ء میں انھوں نے ہی **حسام الحرمین علی منحر الکفر والمین** لکھی، جس میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایسے اکابر دیوبند پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ جس کے جواب میں مولانا خلیل احمد انبیٹھوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سال **المہند علی المفند** لکھ کر مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کو علماے دیوبند کے عقائد کے حوالے سے افترا ے محض کا مرتکب قرار دیا۔ مناظرانہ طبع آزمائی کا یہ سلسلہ اس وقت سے لے کر ابھی تک کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ چناں چہ یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ جب اختلافات کا معاملہ صرف حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین علما تک محدود نہ تھا تو آپ رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر ایک حد سے زیادہ کردار ادا نہ کر سکتے تھے۔

ان جزوی اسباب سے بڑھ کر حقیقت یہ ہے کہ نو آبادیاتی دور اور اس کے بعد مسلمانانِ برّصغیر میں دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث کے نام سے پیدا ہو جانے والی گہری مسلکی شناختوں کے پیچھے وسیع تر تاریخی، الٰہیاتی، سیاسی، سماجی، معاشی، اور ثقافتی عوامل کار فرما تھے جن کے الگ سے تجزیے کی ضرورت ہے۔ یہ موضوع اور اس سے وابستہ سوالات جس توجہ و تحقیق کے مستحق ہیں محدود صفحات پر مشتمل ایک مقالے میں اس سے انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کاوشوں کے محدود نتائج کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک بات قدرے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اتحاد بین المسلمین کا حصول اور فرقہ واریت کا حل صرف شخصیات کے تقدس سے دور ہونا مشکل لگتا ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا ہوتا تو حضرت شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ **الإنصاف في بيان**

۹۳- عبدالماجد دریا آبادیؒ، **نقوش و تاثرات حکیم الامت** (لاہور: مکتبہ مدنیہ، ۱۹۶۴)، ۲۷۵-۲۷۶۔

سبب الاختلاف کے بعد برِ صغیر میں نہ تو اہلِ حدیث اور حنفی اختلاف حد اعتدال سے تجاوز کرتا اور نہ رسالہ **فیصلہ ہفت مسئلہ** کے بعد دیوبندی اور بریلوی اختلاف مستقل تفرقے کی صورت اختیار کرتا۔ یقیناً عظیم شخصیات کی عملی مثال اور تعلیمات سے قوموں کو سمت ملتی ہے اور وہ مینارۂ نور کا کام دیتی ہیں مگر تاریخی عمل کے پیچھے کارفرما دیگر معاشرتی عوامل سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ چناں چہ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:"تاریخ میں معاشرہ کی اجتماعی ذہنیت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ اجتماعی ذہنیت سماجی و سیاسی اور معاشی قوتوں کے ہاتھوں تشکیل پاتی ہے۔۔۔معاشرہ میں اگر تبدیلی کی جدوجہد انفرادی طور پر کی جائے تو اس کے اثرات بہت محدود رہتے ہیں اور ان انفرادی کوششوں سے انقلابی تبدیلی نہیں آتی۔"[۹۴] اگر یہ تجزیہ درست ہے تو ہمیں تفرقہ پیدا ہو جانے کے اسباب کو وسیع تاریخی اور عمرانی تناظر میں دیکھنا ہو گا اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بین المسالک ہم آہنگی کی کوئی بھی کوشش تفرقہ پیدا ہونے کے اسباب جانے بغیر کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔

خاتمہ

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ، تاریخ کے جس دور سے تعلق رکھتے تھے اس میں برصغیر پاک وہند میں انگریزی استعمار کے زیر اثر نئی سیاسی، معاشی، اور معاشرتی حقیقتوں کے سامنے آنے پر تقریباً تمام مقامی اور مذہبی روایات میں اصلاحی اور تجدیدی تحریکیں پیدا ہو گئیں جس میں اسلامی دینی روایت بھی شامل تھی۔ ان تحریکوں اور فکری سرگرمیوں کے نتیجے میں برّصغیر کے مسلمان گہرے مسلکی اختلافات کا شکار ہو گئے تو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان معدودے چند شخصیات میں سے تھے جنھوں نے بین الاسلام مسلکی ہم آہنگی کے لیے کوشش کی اور اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا۔ اگرچہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مصالحانہ کوششیں ایک حد سے زیادہ کارگر نہ ہو سکیں۔ جس کی ایک بڑی وجہ ان کا ذاتی طور پر ہندوستان سے دور ہونا نظر آتی ہے، مگر ان کی تعلیمات سے اتحاد امت کے لیے ایسے آفاقی اصول وضع کیے جا سکتے ہیں جو ہر دور میں کار آمد ہوں۔

بین المسلکی ہم آہنگی کے لیے آپ کی تعلیمات کا محور اہل اللہ کا صلح کل کا جذبہ نظر آتا ہے جس کے اہم نکات یہ ہیں کہ دوسروں کی اصلاح سے پہلے اخلاص کے ساتھ اپنی اصلاح کی فکر، غیر ضروری کلامی موشگافیوں میں غور وخوض سے گریز، تواضع اپناتے ہوئے مناظرہ بازی اور کٹ حجتی سے اجتناب، مسلمانوں کے

۹۴- مبارک علی، **برّصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ**، ۸-۹۔

بارے عمومی حسن ظن اور جہاں تک ممکن ہو، ان کے اعمال اور اقوال کی اچھی تعبیر کرنا، علمی اختلافات کو اہل علم تک محدود رکھنا، اہل قال کا اہل حال کے مسائل کی پوری طرح تفہیم کے بغیر رائے زنی میں احتیاط برتنا، باہمی اختلافات کے باوجود معاشرتی تعلقات بحال رکھنا اور ایک دوسرے پر طعن و تشنیع اور درشت زبان کے استعمال سے باز رہنا، اور یہ کہ اگر کسی فرد یا طبقے کو تنبیہ کی ضرورت محسوس ہو تو اسی حد تک ایسا کرنا جہاں تک اصلاح کی امید ہو اور ایسی روک ٹوک سے گریز کرنا جس میں واضح امکان نظر آرہا ہو کہ ضد میں آکر لوگ غلطی پر اور بھی زیادہ پکے ہو جائیں گے اور فتنے کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

بین الاسلام مکالمہ اور مسلکی ہم آہنگی آج ایک کی اہم ضرورت ہے اور اس موضوع پر ایک مستقل بیانیے کی تشکیل کے لیے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں پنہاں مذکورہ اصول اہم شروعات ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہاں اس مغالطے میں نہیں پڑنا چاہیے کہ جب خود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں ان اصولوں کا کچھ زیادہ مثبت نتیجہ نہ نکل سکا تو بعد میں کیوں کر ایسا ممکن ہو گا، اس لیے کہ مذکورہ بالا اصولوں کی مثال اخلاقی اقدار کی سی ہے کہ اگر کسی ایک زمانے یا قوم کے تاریخی تجربے میں کچھ اخلاقی اقدار مثلاً امانت، دیانت، سچائی، اور احسان شناسی رو بہ عمل نہ لائی جا سکیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ایسی اقدار ہمیشہ کے لیے ناکارہ ثابت ہو گئیں ہیں۔ حالات اور افراد کے بدلنے سے انھی اخلاقی اقدار میں اپنی معنویت اور افادیت منوا لینے کی پوری صلاحیت پنہاں ہوتی ہے۔